میاں عبدالرشید

عالمی مرکز اور بین الاقوامی معاشرہ

حلقہ رامرکز چو جاں در پیکر است (اقبالؒ)

اسلامی معاشرہ جس کی ابتدا محلہ سے شروع ہوئی جس میں نظامِ صلوٰۃ نے نظم، اطاعتِ امیر، باہمی تعاون، پابندیٔ وقت، صفائی اور چستی پیدا کی۔ جسے زکوٰۃ و صدقات نے معاشی افراط و تفریط سے بچا کر اس میں مالی ہمواری پیدا کی اور اسے معاشی تحفظ دے کر اسے اور مستحکم کیا۔ روزوں نے جس کے افراد میں ضبطِ نفس ایثار اور روحانیت کے اوصاف پیدا کر کے اس کے انفرادی اجزا کو جمال و قوت سے مزیّن کیا۔ اب اسے علاقائی، ملکی اور قومی سطحوں سے اٹھا کر بین الاقوامی یا عالمی سطح پر لے جانے کی ضرورت تھی تاکہ پوری انسانیت بلا لحاظ رنگ و نسل اس سے مستفید ہو سکے۔ حضورؐ اس وجہ سے رحمۃ للعالمین ہیں کہ حضورؐ کا پیغام اور نظام دنیا بھر کے انسانوں کے لیے بلا تخصیص ملک و نسب، رحمت اطمینان، معاشی تحفظ اور امن کا باعث ہے۔ اس لیے جب تک حضورؐ کے پیغام اور پروگرام پر مبنی معاشرہ پوری انسانیت کو اپنے آغوش میں نہ لے لیتا اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی پوری انسانیت کو اوجِ کمال تک پہنچانا ہے۔ "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر رحمت عالموں کے لیے۔" (۲۱: ۷-۱) "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر و نذیر تمام انسانوں کے لیے۔ (۳۴: ۲۸)۔ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے ہر دین پر غالب کرے (۲۸: ۲۸)۔

ویسے تو اس معاشرہ کا مزاج شروع ہی سے بین الاقوامی یا عالمی تھا کیونکہ اس کا محور

اللہ کی بلند و پاک ذات ہے جو تمام کائنات کے خالق ہیں۔ جو بے جہت اور لامکان ہیں۔ جنہوں نے ہر نسل اور رنگ اور ہر ملک اور قوم اور قبیلہ اور خاندان کے انسانوں کو پیدا فرمایا۔ اور جنہیں ہر انسان بطور انسان عزیز ہے اور وہ اس کی ترقی و سربلندی کے خواہاں ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا الخلق عیال اللہ (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے)۔ ایک خدا کا تصور ہی شعوب و قبائل اور نسل و رنگ کے بتوں کو پاش پاش کرنے اور جغرافیائی حد بندیوں کو ملیا میٹ کرنے کے لیے کافی تھا مگر اس پر مزید زور دینے کے لیے یہ بھی فرما دیا کہ پیدائش کا اتفاق وجہ تفاخر و تکرم نہیں۔ شعوب و قبائل صرف اس لیے ہیں تاکہ مختلف لوگ ایک دوسرے سے پہچانے جا سکیں۔ ورنہ اصل تکریم تقویٰ سے ہے (۴۹ : ۱۳)۔ جتنا کوئی شخص برائی سے بچے گا اور نیکی کو اختیار کرے گا اتنا ہی وہ قابلِ عزت ہوگا۔ آخر ایسا وسیع مشرب و معاشرہ جس کا آغوش ہر اس شخص کے لیے وا ہو جو ایک خدا، تسلسل حیات (آخرت) اور نیکی پر ایمان رکھتا ہے کیسے اپنے آپ کو رنگ و نسل شعوب و قبائل اور ملک و وطن کی تنگناؤں میں مقید کر سکتا تھا۔ اس معاشرہ کا رنگ اللہ کا رنگ ہے (۲ : ۱۳۸)۔ ملکوں، نسلوں اور قبیلوں کا رنگ نہیں اور اللہ کا رنگ کائناتی بلکہ آفاقی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں ان امور پر جو دوسروں سے مشترک ہیں زیادہ زور دیا گیا ہے اور اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس معاشرہ کے ہر فرد کے لیے پچھلی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ مختلف رسولوں میں بطور رسول کوئی فرق نہیں کرتے (۲ : ۲۸۵) (۳ : ۸۴) بلکہ ہر ایک کا احترام کرتے ہیں اور ہر ایک کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ قرآن پاک کے نزدیک اصل کافر وہی ہیں جو بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض سے انکار کرتے ہیں (۴ : ۱۵۰ - ۱۵۱)۔ جہاں بدنظمی اور لاقانونیت کے نقصانات گنائے گئے ہیں ان میں مساجد کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے عبادتخانوں اور عام درویشوں کے خلوت کدوں کا بھی ذکر ہے (۲۲ : ۴۰)۔ قرآن پاک کا اعلان ہے کہ یہودیوں

صابیوں اور عیسائیوں میں سے جو بھی ایک اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں وہ خوف و حزن سے مصئون ہوں گے (۵ : ۶۹)۔ اسی لیے قرآنِ پاک ان سب لوگوں کو جو اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اشتراکِ عمل کی برملا دعوت دیتا ہے :

"اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے: کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنے پروردگار نہ سمجھیں (روحانی یا معاشی لحاظ سے) لیکن اگر وہ پھر جائیں تو ان سے کہہ دو: تم گواہ رہو کہ ہم اللہ کے (سچے) فرمانبردار ہیں (۳ : ۶۴)۔

اس ضمن میں قرآن پاک حضرت ابراہیمؑ کا ذکر خاص طور سے کرتا ہے کیونکہ معلومہ تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ ہی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے خدائے واحد کی پرستش پر خاص طور سے زور دیا اور اپنے اس عقیدہ کی خاطر سخت سے سخت مصائب برداشت کیے۔

انھوں نے اپنے ملک کے مطلق العنان بادشاہ سے جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا اور جس کے نزدیک کسی کو مروا دینا معمولی بات تھی، کھلم کھلا ٹکر لی۔ بادشاہ کے بعد عزت اور دولت کے لحاظ سے سب سے بڑے بت کدہ کے پروہت کا مرتبہ تھا اور یہ رتبہ ان کے قدموں میں تھا مگر اسے خود ٹھکرا دیا اور لوگوں کو عملاً بتانے اور اس بات کو صحیح طور سے ان کے ذہن نشین کرنے کے لیے کہ بتوں کا کوئی اختیار نہیں، بتوں کی تحقیر و تذلیل کر کے پجاریوں اور عوام الناس سے دشمنی مول لی۔ یہاں تک کہ حکومت اور عوام نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ آپ نے بادشاہ اور عوام سب سے صاف صاف کہہ دیا کہ جو اللہ کا دشمن ہے وہ میرا بھی دشمن ہے۔ اسی حق پرستی کی خاطر عیش و آرام اور دولت و مرتبہ کی زندگی تج کر صحرا میں جا آباد ہوئے۔ اللہ کے حکم کے مطابق اپنے ننھے بیٹے کو ماں سمیت بے آب و گیاہ ریگستان میں چھوڑ آئے۔ جب بیٹا ذرا بڑا ہوا تو اسے اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر

تیار ہو گئے۔

قرآن پاک اسلام کو دین ابراہیمؑ کے نام سے موسوم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ نام حضرت ابراہیمؑ ہی کا رکھا ہوا ہے (۲۲ : ۷۸)۔ مسلم کے لفظی معانی ایک اللہ کے سامنے پوری طرح سر اطاعت خم کر دینے کے ہیں۔ اس لیے فرمایا:

"اور اس شخص سے بہتر دین کس کا ہے جس نے اپنا سر اللہ کے سامنے جھکا دیا اور حسین اعمال کیے اور ابراہیمؑ حنیف کی ملّت کی پیروی کی اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا تھا" (۴ : ۱۲۵)۔

حنیف وہ ہے جو ایک خدا کا پرستار ہو اور اس کے مقابلہ میں اور کسی کی پروا نہ کرے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہی بتایا گیا ہے کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ حنیف تھے۔ اور جناب رسولؐ کے پیرو انہیں کی ملت پر ہیں:

ملتِ عشق از ہمہ دین ہا جداست
عاشقاں را مذہب و ملّت خداست (رومیؒ)

اس عالمی اور بین الاقوامی رنگ کے باعث اسلام نے دوسرے مذاہب کی طرح عبادت کو صرف عبادت خانوں تک محدود نہ رکھا بلکہ تمام روئے زمین کو عبادت گاہ قرار دیا اور نہ عبادت کی ادائیگی کو خاندانی پروہتوں سے مخصوص کیا۔ لامکان معبود کی عبادت مکانوں کے ساتھ کیسے محدود کی جا سکتی تھی۔ اور جو معبود اپنے ہر بندے کے قریب ہو اس کے اور اس کے بندوں کے درمیان کسی کو حائل ہونے کی کیسے اجازت دی جا سکتی تھی؟

لیکن اس کے باوجود مقررہ نماز کے لیے ایک سمت کا تعین ضروری تھا تاکہ یک رنگی اور ہم آہنگی کی ظاہری صورت بھی ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی ایک طرف منہ کر کے کھڑا ہے اور کوئی دوسری طرف منہ کر کے بیٹھا ہے۔ کسی کا منہ مشرق کی طرف ہے اور کسی کا مغرب کی طرف۔ اس لیے عبادت کے لیے ایک جہت مقرر کر دی مگر یہ بھی فرما دیا:

مشرق و مغرب اللہ کے لیے ہے۔ پس جدھر تم رخ کرو گے اللہ کا چہرہ پا لو گے۔ (۲ : ۱۱۵)۔

ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا:

ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی جہت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے پس تم نیکیوں کی طرف دوڑو (۲ : ۱۴۸)۔ یعنی تم بھاگ بھاگ کر نیکی کرنا اپنا مقصود قرار دو۔

آگے اس بات کو اور کھول کر بیان فرما دیا:

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ یوم آخر، ملائکہ، کتاب اور نبیوں پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی محبت کی خاطر قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوالیوں کو نیز قیدیوں کو رہائی دلانے کے لیے اپنا مال دیا۔ نماز قائم کی۔ زکاۃ ادا کی (یہ لوگ وہ ہیں) جو وعدہ کرتے ہیں تو اس پر پورے اترتے ہیں۔ جو تنگی، نقصان اور لڑائی میں ہمت نہیں ہارتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور یہی متقین ہیں۔ (۲ : ۱۷۷)۔

اور وہ جہت کونسی مقرر فرمائی؟ ایک ایسے مکان کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا جو پہلے دن سے "اللہ کا گھر" ہے۔ جسے نہ کسی انسان کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے اور نہ وہ کسی انسان سے منسوب ہے۔ ہاں اس کی اتنی نسبت ایک اولوالعزم موحد کے ساتھ ضرور ہے کہ اس نے اس کی تعمیر نو کر کے اسے دنیا سے دوبارہ روشناس کرا دیا۔ دنیا اللہ کے اس اولین گھر کو بھول چکی تھی اس نے دنیا کو اس سے دوبارہ متعارف کرایا اور یہ کام اسی کو زیب دیتا تھا جس نے اپنے وقت کی دنیا کے بتکدے میں توحید کی آواز بلند کی اور تمام بڑے اور چھوٹے اور نئے اور پرانے خداؤں کو سرنگوں کر دیا اور اپنے اس عقیدہ کی خاطر مرتے دم تک مسلسل جد و جہد کی، جزیرہ نمائے عرب کے شہر مکہ میں واقع بیت اللہ شریف کو جو پہلے دن سے خدا کا گھر تھا مگر جس کی تعمیر نو حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی، مسلمانوں کے لیے قبلہ قرار دیا گیا۔ ملک عرب

دنیا کی سب سے پرانی تہذیب کا گہوارہ تھا جیسا کہ اب ماہرین آثار قدیمہ کی نئی تحقیقات ثابت کر رہی ہیں، شہر مکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کو ملانے والی شاہراہوں کے سنگم پر تھا۔ حضرت ابراہیم معروف تاریخ کے سب سے بڑے موحد تھے جن کی شخصیت کو دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے پیرو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے اس مکان میں شرف و بزرگی بین الاقوامیت اور مرکزیت کے وہ تمام خصائص مجتمع تھے جو قبلہ کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں۔ اس پر اضافہ یہ فرمایا کہ حرم کعبہ کو امن کی جگہ قرار دیتے ہوئے وہاں لڑائی کو ممنوع قرار دیا یہاں تک کہ وہاں کسی جانور کے شکار تک کی اجازت نہ دی۔ جیسے آج کل کی زبان میں جنگ کے دوران بعض شہروں کو "کھلے شہر" قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے تحریک اسلام کے مرکز اور قلب کو شروع ہی سے "کھلا شہر" قرار دیدیا۔ اور امن کی جگہ بنا دیا۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: اللہ نے جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو قابلِ احترام قرار دیدیا۔ پس وہ اللہ کے حکم کے باعث قابلِ احترام ہے۔ اس میں قتال، نہ مجھ سے پہلے کسی پر حلال ہوا اور نہ میرے بعد ہوگا نہ اس کے شکاروں کو بدکایا جا سکتا ہے نہ اس کا کانٹا توڑا جا سکتا ہے نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی ہے نہ اس کی گم شدہ چیز حلال ہو سکتی ہے۔ مگر اس شخص پر جو اس کو ڈھونڈ رہا ہو۔"

یہ تو ظاہری خوبیاں ہیں جو اس مکان کے ساتھ وابستہ تھیں اور ہیں۔ اور جو باطنی فیوض و برکات وہاں نازل ہوتے ہیں انہیں کوئی صاحب دل ہی بتا سکتا ہے۔

یوں تو حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہیں اور کوئی جگہ ان کے انوار کی برکات سے خالی نہیں لیکن بعض مکانوں کے ساتھ تجلیات مخصوص ہیں جیسے طور۔ اس لحاظ سے کعبۃ اللہ افضل ترین مکان ہے۔ وہاں جو کیفیات قلوب پر طاری ہوتی ہیں ان کا تعلق محسوس کرنے سے ہے بیان کرنے سے نہیں۔ ایک صاحب دل ہی سے سنیئے:

"زبان انھیں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ قلم انھیں لکھنے سے عاجز ہے۔ قلب میں اللہ کی محبت موجزن ہے۔ آنکھیں ہیں کہ ان میں آنسو امنڈ کے آتے ہیں اور بدن ہے کہ اسے مارے خوف کے پسینوں پر پسینے آ رہے ہیں۔ ایک وقت میں اتنی کیفیات اور اس شدت سے کسی اور جگہ حاصل نہیں ہو سکتیں اور عبادت کا اصل مقصود اللہ کی محبت خشیت اور عبودیت ——— یہ جذبات اس جگہ بدرجہ اتم حاصل ہوتے ہیں۔"

اسی معاشرہ کو بین الاقوامی سطح پر پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے بیت اللہ شریف کو بین الاقوامی مرکز قرار دیا گیا تاکہ وہاں مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں کے وہ لوگ جو انفرادی اور اجتماعی تعمیر کردار کے مقصد اور اس کے حصول کے اس پروگرام سے جو شریعتِ محمدی پیش کرتی ہے متفق ہوں۔ سال میں کم از کم ایک بار جمع ہوں۔ اپنی سال بھر کی علاحدہ علاحدہ کارروائیوں کا جائزہ لیں۔ اپنی مشکلات اور مسائل زیر بحث لائیں۔ آئندہ کے لیے اپنا لائحۂ عمل مرتب کریں۔ تاکہ اسلام دنیا کے مختلف حصوں میں محض علاقائی تحریکوں کی صورت میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ ایک اجتماعی عالمی قوت بن سکے۔ اسلامی پروگرام میں اس مقصد کے لیے حج کا فریضہ رکھ دیا گیا۔ سال بھر میں ایک بار مقررہ ایام میں دنیا بھر کے مسلمان دور دراز علاقوں اور ملکوں سے مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ہر اس مسلم پر جو راستے کا خرچ رکھتا ہو عمر میں ایک بار حج ادا کرنا فرض ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے پاس زادِ راہ ہو۔ اگرچہ جہاں یہ فرمایا وہاں ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ "بہترین زادِ راہ تقوٰے ہے"۔ اسلام نے اس فریضہ میں بھی حسبِ معمول تعلق باللہ پر پورا زور رکھا اور حج کے دوران مختلف دعاؤں کے علاوہ اللہ کی یاد کا تاکیدی حکم دیا (۲: ۱۹۸- ۲: ۲۰۰)۔ تقوٰے کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لڑائی جھگڑے اور عورتوں کی طرف رغبت سے منع فرمایا (۲: ۱۹۷)۔ حج کے

دنوں میں شکار کی اجازت نہ دی۔ البتہ جائز تجارت کی اجازت دیدی (۲: ۱۹۸)۔ لوگوں کو حج کے لیے پکارنے کا ارشاد ہوا "تاکہ ان کے لیے اس میں جو منافع ہیں وہ ان سے تمتع اندوز ہوں" (۲۲: ۲۷، ۲۸)۔ وہ منافع روحانی بھی ہیں عقلی بھی اور مالی بھی۔ انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی، علاقائی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔

سب سے پہلے تو وہی توحید کا عہد ہے جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی اور اس دور کی یاد قائم رکھنے کے لیے جب یہ عہد پہلے پہل کیا گیا تھا اب بھی اسے اسی طریق سے یعنی ایک مقدس پتھر (حجر اسود) پر ہاتھ رکھ کر باندھا جاتا ہے۔ اگر ہجوم ہو تو دور ہی سے ادھر ہاتھ اٹھا کر اس پیمان کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس عہد سے زیادہ محبت ہو تو فورِ جذبات سے وہ پتھر چوم لینے کو بھی جی چاہ آتا ہے۔ اس کے بعد کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ اللہ کے اس گھر کے گرد والہانہ طور سے سات چکر لگائے جاتے ہیں اور اس طرح اس گھر کے مالک سے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس پر ہم سب دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ ذرا اس نظارہ کا تصور اپنے ذہن میں لائیے "مختلف ملکوں نسلوں اور رنگوں کے ہزاروں لاکھوں انسان بیک وقت ہاتھ اٹھا کر ایک اللہ سے وفاداری کا عہد و پیمان کر رہے ہیں اور پھر اس کے گھر کے گرد پروانہ وار چکر کاٹ رہے ہیں اور اس پر دل ہی دل میں نثار ہو رہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں لبوں پر دعائیں ہیں۔ کوئی چوکھٹ تھامے اپنی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو برسا رہا ہے۔ کوئی غلاف سے لپٹا اپنے گناہوں پر نادم رو رہا ہے۔ کوئی کسی دیوار سے لگا سجدہ میں پڑا ہے۔ سائے مجمع پر وارفتگی کا عالم چھایا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صاحبِ خانہ ہر ایک سے آ آ کر خود مل رہا ہے اور اس کے جلالِ کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

حج کی اصل صورت میدانِ عرفات میں دنیا کی ہر نسل، قوم اور رنگ کے انسانوں کا اپنے اپنے علاقائی، ملکی اور قومی لباس اتار کر سادہ ترین لباس احرام میں ایک جیسی

ظاہری صورت بنا کر کل کائنات کے مالک کے حضور میں "لبیک اللھم لبیک" (حاضر ہیں ہم اے اللہ حاضر ہیں) پکارتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں کوئی نسلی یا ملکی یا جغرافیائی اختلاف حائل رہ سکتا ہے؟ ایسے پاکیزہ ماحول میں اس قسم کے بین الاقوامی اجتماع کا پروگرام کسی اور مذہب یا نظم میں نظر نہیں آتا۔

اس طرح اللہ سے قریبی تعلق استوار ہوتا ہے اور خشوع و خضوع کے باعث ایسی نظمہ حاصل ہو جاتی ہے کہ اپنی معمولی سے معمولی فروگذاشتیں اور کوتاہیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ انسان ان سے بچنے کا عہد بھی کرتا ہے اور اس عہد میں اس وقت کی قلبی کیفیت کے لحاظ سے استقامت اور پائیداری بھی ہوتی ہے۔ آئندہ کے لیے انفرادی، ملکی، قومی اور بین الاقوامی جد و جہد کے لیے پروگرام بھی بنائے جا سکتے ہیں اور اس قلبی کیفیت کے باعث جو اس وقت حاصل ہوتی ہے یہ پروگرام زیادہ موثر اور زیادہ جامع بنتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں ملکی، قومی اور نسلی حدود سے اوپر اٹھ کر انسانی سطح پر سوچا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اس میدان میں غریب، امیر، آقا اور خادم، کالے اور گورے، حاکم اور محکوم، عالم اور جاہل سب بطور انسان ایک ہی سطح پر ایک ہی لباس، ایک ہی بھیس، اور ایک ہی رنگ میں ایک خدائے حقیقی کے سامنے سر کھولے، ہاتھ پھیلائے اور ایک جیسے الفاظ زبان پر لائے کھڑے ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے انسانوں کی مصنوعی حد بندیوں کو پاٹنے اور انھیں بطور انسان ایک دوسرے کے قریب تر لانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور پروگرام ہو سکتا ہے؟

انھیں نہیں بلکہ اس وقت ہر ایک کی آنکھوں میں میدان حشر کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ جب دنیا بھر کے پہلے اور پچھلے انسان ایک میدان میں ایک اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے حق تعالیٰ کے حضور یکہ و تنہا حاضر ہوں گے۔ نہ کوئی کسی کا ساتھی ہوگا نہ مددگار۔ جو شخص یہ نقشہ یہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اس کے لیے اپنی زندگی کو بدلنا نہایت آسان ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے اسے اصل حشر سے پہلے ایک بار اپنے آپ کو درست کرنے کا موقع نصیب ہو گیا۔ اسی لیے

حضورؐ کا فرمان ہے کہ حج کے پہلے سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جو شخص اس کے بعد بھی اپنے آپ کو نہ بدلے وہ بہت ہی بے نصیب ہے۔

وہاں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمانوں سے مل کر تبادلۂ خیالات کر کے تعلقات بڑھا کر انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو بین الاقوامی معاشرہ کا رکن محسوس کرنے لگتا ہے اور ملکی، قومی، اور قبائلی تعصبات سے بالا ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں خود بخود وسعت آجاتی ہے۔ اور وہاں پہنچا ہوا غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل مسلمان بھی اللہ کی گہری محبت اور انسانیت سے وسیع ہمدردی کی ایسی گران بہا دولت سے دامن بھر کے واپس آتا ہے جو دوسرے معاشروں کے بڑے بڑے عالموں اور سیاحوں کو نصیب نہیں ہوتی۔

عرفات سے واپسی پر لوگ مشعر حرام کے پاس آکر ٹھہرتے اور رات گزارتے ہیں جہاں زور شور سے اللہ کا ذکر کرنے کا حکم ہے (۲: ۱۹۸)۔

صبح لوگ منیٰ میں آجاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے عظیم اور حنفاء کے سرگروہ جلیل حضرت ابراہیم خلیل اللہ اپنے بیٹے کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کے لیے لٹا چکے تھے اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور کہا "بس تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اتر گئے۔" اس کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دین حنیف کے ہزاروں شیدائی اور ملتِ ابراہیم کے لاکھوں فدائی وہاں اللہ کے نام پر کروڑوں ذبیحے کر کے سنت ابراہیمی کو تازہ کرتے اور وقت آنے پر اپنی عزیز ترین متاع اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کا پیمان باندھتے ہیں۔

لیکن اس نظام کی حقیقت شناسی اور روح توازن و اعتدال کا کیا کہنا کہ قربانی کے حکم کے ساتھ ہی اس عمل کی روح کا بھی بیان فرما دیا تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ

محض صورت سے خوگر ہوکر اس کی روح سے غافل نہ ہوجائیں۔ فرمایا: "اللہ کو ان قربانیوں کا گوشت اور لہو نہیں پہنچتا البتہ اسے تمہاری طرف سے تقوائے پہنچتا ہے۔" (۲۲: ۳۷)۔

یہاں ہیں مسٹر ایچ۔ اے۔ آر گب پروفیسر عربی لنڈن یونیورسٹی کی ایک پرانی مگر قابلِ قدر تصنیف "اسلام کا مستقبل" سے چند اقتباسات پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

" ایسے تمام مذہبی دستوروں میں سے جو اسلام کی روحِ اتحاد کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ موثر ترین دستور فریضۂ حج ہے۔ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر سخت ترین فرقہ وارانہ مناقشات بھی ختم کر دیے جاتے ہیں۔ . . . . جو مسلم حج کے موقع پر ہر نسل اور ہر ملک کے اپنے کروڑوں ہم مذہبوں کے ساتھ مشترکہ عبادت کی روحانی بلندی محسوس کرچکا ہو وہ اس اعلیٰ روحانی کیفیت کو تاعمر نہیں بھول سکتا اور یہی کیفیت اسلام کی داخلی قوت اور بیرونی وسعت کی مظہر ہے۔ حج سے واپس آکر ہر شخص اپنے محدود حلقہ میں اسی وسیع اسلامی اتحاد و اخوت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ جس کا مظہر خود حج ہے اور جس کا نظارہ وہ مکہ معظمہ میں کر کے آیا ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ جذبہ تمام چھوٹی چھوٹی تفرقہ بازیوں پر چھا جاتا ہے اور اس شخص کے ذریعہ اسلام کے بالائے اقوام تصورات نئے اور پُرجوش طریق سے پھیلنے شروع ہوجاتے ہیں۔

"۔ . . . ابھی اسلام کے ذمہ بنی نوعِ انسان کی ایک اور خدمت بھی ہے۔ آخر یہ یورپ کی نسبت اصل مشرق سے زیادہ قریب ہے اور بین النسلی مفاہمت اور تعاون کی شاندار روایات کا حامل ہے۔ دنیا کی کوئی معاشرت بنی نوعِ انسان کی اتنی زیادہ اور اس قدر مختلف نسلوں کو بہ حیثیت مواقع اور کوششوں کے لحاظ سے متحد کرنے میں اسلام جیسا شاندار ماضی نہیں رکھتی۔ افریقہ، ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کی عظیم مسلمان قومیں اور ان کے علاوہ چین کی مسلم اقلیت اور جاپان کے بہت ہی قلیل التعداد مسلمان بہ ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی تک اسلام میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ نسل اور روایات کے بظاہر ناقابلِ مصالحت عناصر

میں مصالحت پیدا کر سکے۔ اگر کبھی اصل مشرق اور مغرب کی معاشرتوں کے اختلاف کو ان کے باہمی تعاون میں تبدیل کرنا پڑا تو اس مقصد کے لیے لامحالہ اسلام کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔ یورپ کو غیر اسلامی مشرق میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل بھی اسلام ہی کے پاس ہے۔"

اسلام باوجود اپنے وسیع پھیلاؤ کے ماضی میں مختلف قوموں اور ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں شاندار عملی خدمات سرانجام دے چکا ہوا ہے۔ اور آئندہ بھی اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ "ایک دنیا کی ایک حکومت" کے نعرہ کو عملاً صحیح کر دکھائے گا۔ خالی خولی باتوں سے نہیں بلکہ ایک صحت مند اور جاندار معاشرہ قائم کر کے۔ آج بھی علاقائی اور قومی تحریکوں کے باوجود تمام دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں باہمی تعلقات کا احساس پایا جاتا ہے اور ایک ملک کا مسلمان دوسرے اسلامی ملک میں سوائے زبان کے فرق کے اور کوئی شدید فرق محسوس نہیں کرتا۔ نیشنلزم کے اثر سے پہلے دنیائے اسلام میں باہمی ربط کا اثر نسبتاً گہرا تھا۔ اب بھی اس کی مساوات، اس کی اخوت، اس کی بین المذاہبی رواداری اور اس کے بین الممالکی تعلقات کو کام میں لاکر اور زندگی کے متعلق اس کے متوازن اور صحت مندانہ انداز فکر کی مدد سے دنیا بھر کے ملکوں، قوموں، مذہبوں اقتصادی اور مالی نظاموں کے اختلافات کو کم از کم کر کے انھیں ایک دوسرے سے قریب تر لایا جاسکتا ہے اور اس طرح ہم ایک دنیا کے خواب کو جلدی حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔